© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حکومت عدلیہ کشمکش اور جمہوریت کا مستقبل

خورشید احمد

پاکستانی قوم گذشتہ اڑھائی تین مہینے سے جس کرب ناک آئینی بحران سے دوچار ہے وہ ہماری سیاسی قیادت کے فکری اور اخلاقی افلاس کا آئینہ دار ہے۔ آزادی کے پچاس سال بعد اور سیاسی در و بست کے بار بار بگڑنے اور تلخ تجربے کرنے کے باوجود جس سہل انگاری' عاقبت نااندیشی اور ایک گونہ انانیت کے ساتھ نہایت بنیادی' دستوری اور ادارتی امور سے کھیلا گیا ہے' وہ سخت پریشان کن ہے۔ بظاہر پانچ ججوں کے سپریم کورٹ میں تقرر سے بادل چھٹنے اور گرد بیٹھ جانے کا تاثر دیا جا رہا ہے لیکن گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ کش مکش ایک ذرا مستور شکل میں برابر جاری ہے اور ملک و ملت کے بہی خواہ سرگراں ہیں کہ ع

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین

یہی وہ حالات ہیں جو اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ مسئلے کا بے لاگ اور معروضی جائزہ لیا جائے اور ان حقیقی اسباب و عوامل کی نشان دہی کی جائے جو بگاڑ کے ذمہ دار ہیں۔ مسئلہ محض "مشیروں" کے غلط مشوروں کا نہیں کہ اس کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ اصل ذمہ داری مشیروں کے انتخاب اور تقرر کرنے والوں اور ان کے مشوروں پر عمل کرنے والوں کی ہوتی ہے اور "بندر کی بلا طویلے کے سر" والا رویہ نہ صرف یہ کہ غیر حقیقت پسندانہ ہے بلکہ خود فریبی اور تباہی کا راستہ ہے۔

---

۲۰ مارچ ۱۹۹۶ پاکستان کی سیاسی اور آئینی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز سپریم کورٹ نے اپنے ایک تاریخی فیصلے کے ذریعے ملک کے دستوری ڈھانچے کو ایسی بنیادوں پر مستحکم کرنے کی کوشش کی جو جمہوریت کے مستقبل اور قانون کی حکمرانی کے لیے باب کشا تھا۔ یہ فیصلہ عدالت عالیہ کے فل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنچ کا متفق علیہ فیصلہ تھا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے سوچ بچار اور کرب و اضطراب سے گزرنے کے بعد سپریم کورٹ نے ملک کی دستوری حکومت کی گاڑی کو پٹڑی پر لانے کے لیے ایک تاریخی اقدام کیا۔ افسوس ہے کہ اس فیصلے کو بھی سیاسی قیادتوں نے اپنے اپنے سیاسی کھیل میں فٹ بال بنانے کی کوشش کی اور اصلاح حال کے لیے جو فیصلہ کن دروبست تجویز کیا گیا تھا' اسے انا اور ذاتی اقتدار کی خاطر سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی اور اب تک اسے دل سے قبول کر کے اس کے مطابق آئینی اداروں کو مستحکم کرنے کی کوئی فکر اور کوشش نظر نہیں آ رہی ہے۔ روشنی کی واحد کرن یہ ہے کہ عدالت عالیہ بڑی حد تک اپنے موقف پر قائم اور مستحکم ہے اور اسے پریس اور پسے ہوئے عوام کی بڑھتی ہوئی تائید حاصل ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ اصل مباحث کیا ہیں اور وہ کیا معاملات ہیں جو داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ ہماری نگاہ میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے مستقبل کا انحصار اس بحران سے کامیابی سے عہدہ برآ ہونے پر ہے۔

آمریت' خواہ فوجی ہو یا سول' اختیارات کے ارتکاز اور مرکزیت سے عبارت ہے جب کہ جمہوریت کی بنیاد آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی سیاسی اداروں کے درمیان قوت اور اختیارات کا توازن اور جواب دہی کا مربوط نظام ایک مہذب اور جمہوری معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ استبداد (tyranny) اور انتشار اور نراج (anarchy) کی دو انتہاؤں سے بچنے کا موثر ترین ذریعہ یہی توازن اختیارات ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

جدید ریاست میں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف اقتدار کے تینوں مرکزی عضو (organs) پارلیمنٹ' حکومت اور عدلیہ میں تقسیم اختیارات میں مکمل توازن اور مناسب تحدیدات (checks and balances) ہوں تو دوسری طرف عوام میں سیاسی بیداری' ملک میں تنقید و احتساب کی آزادی اور پریس اور میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں تاکہ ہر ادارہ اپنے دائرے میں آزادی اور اعتدال کے ساتھ کام کر سکے اور اجتماعی آداب کا پورا پورا احترام کرے۔ کسی ایک کا دوسروں پر حاوی ہو جانا ہی دراصل پورے نظام کو تہ و بالا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

ہمارے ملک کی سیاسی قیادت نے اپنی جمہوریت پسندی کے تمام دعووں کے علی الرغم جس طرح شہریوں کے بنیادی حقوق کو پامال کیا ہے' صحافت اور میڈیا کو لگام دینے کی کوشش کی ہے اسی طرح عدالت کو بھی اپنے قابو میں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس سلسلے میں جو اقدام کیے گئے ان میں عدلیہ کے آئینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیارات کو محدود و مقید کرنا، عدلیہ میں اپنی پسند کے لوگوں کا میرٹ کے اصولوں کو پامال کرتے ہوئے تقرر کرنا، عدلیہ کے "ناپسندیدہ فیصلوں" کو نظرانداز کرنا بلکہ ان کی کھلی خلاف ورزی کرنا، تحقیر کرنا اور انھیں غیر موثر بنانے (undo) کے لیے نت نئے حربے استعمال کرنا اور عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے دستوری تقاضے کو پورا نہ کرنا زیادہ اہم ہیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں پیپلز پارٹی کی بے نظیر حکومت کے اس گھناؤنے اقدام نے جس کے ذریعے ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں اپنے من پسند ججوں کی تھوک کے حساب سے تقرری، معتبر اور تجربہ کار ججوں کی فارغ خطی، سینیر ججوں ہی نہیں ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان تک کی بلامشورہ منتقلی اور شریعت کورٹ میں ان کو dump کرنے کی جسارت کی گئی، عدالت عالیہ کے صبر کے پیمانے کو لبریز کر دیا اور اس نے ملک کے نظام عدل کو بچانے کے لیے ایک فیصلہ کن اقدام کیا --- یعنی ۲۰ مارچ کا فیصلہ۔ اس فیصلے کے ذریعے عدالت نے ملک کے نظام عدل کو دستور کے مطابق تحفظ دینے اور اسے سیاسی قیادت کی دراندازی سے بچانے کے لیے واضح اصول طے کیے جن پر عمل کر کے ملک جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی طرف حقیقی پیش رفت کر سکتا ہے۔ اس فیصلے کو جہاں عوام نے ایک تاریخی سنگ میل سمجھا وہیں وقت کی حکومتوں نے اسے اپنے آمرانہ عزائم کی راہ میں ایک سنگ گراں تصور کیا۔ یہی وہ چیز ہے جو مارچ ۱۹۹۶ سے اب تک حکومت اور عدلیہ کے تصادم کا اصل سبب بنی ہوئی ہے۔ محض خلط مبحث کی خاطر اسے "پارلیمنٹ اور عدلیہ کی کش مکش" یا "پارلیمنٹ کی بالادستی کو خطرہ" قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ اس قوم کا المیہ ہے کہ اس کی دونوں روایتی بڑی پارٹیاں، جن میں سے ایک فیصلے کے وقت برسر اقتدار تھی اور دوسری اس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے، اپنے اپنے دور میں اقتدار کے نشہ میں اس فیصلے اور اس کے تقاضوں کو غیر موثر کرنے میں مصروف رہے۔

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ فیصلہ کیا ہے اور اس کے ذریعے کن اصولوں کو طے اور مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جو بحثیں ملک میں ہو رہی ہیں، ان میں اس فیصلے کے تاریخی مضمرات کا پورا شعور تک موجود نہیں۔

۱- پاکستان محض ایک سیکولر ریاست نہیں بلکہ ایک اسلامی ریاست ہے جو خدا کی حاکمیت اعلیٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس ملک میں تمام امور اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں طے ہونے چاہییں۔ یہ تقاضا ہے قرارداد مقاصد [جو اب دستور کا قابل تنفیذ حصہ ہے ۲ (الف)]، آرٹیکل ۲ جس کی رو سے اسلام ریاست کا دین ہے، آرٹیکل ۲۷۰ جو قرآن و سنت کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اس حلف کا جو صدر، وزیراعظم، چیف جسٹس، وزرا، جج اور ارکان پارلیمنٹ سے لے کر تمام ذمہ دار اٹھاتے ہیں۔ یہی دستور کی سب سے اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیاد ہے اور اس کے تحت ریاست اور اقتدار ایک امانت (trust) ہے جسے عوام کے نمائندوں کے ذریعے ان حدود میں ادا کیا جائے گا جو اسلام نے طے کی ہیں۔

۲۔ اسلامی ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا دستور جن بنیادوں کو مزید واضح کرتا ہے، ان کا تعلق ملک کے پارلیمانی جمہوری نظام، وفاقی ہیئت، بنیادی حقوق کے تحفظ اور عدلیہ کی مکمل آزادی سے ہے۔

۳۔ پاکستان کا دستوری ڈھانچہ اقتدار کو تین اداروں میں مکمل توازن کے ساتھ تقسیم کرتا ہے۔ قانون سازی کا حق پارلیمنٹ کا ہے، نظام حکومت کو چلانے کی ذمہ داری انتظامیہ پر ہے جو وزیراعظم، کابینہ اور ماتحت بیوروکریسی پر مشتمل ہے اور قانون کے نفاذ کی نگرانی اور اس کی تعبیر کا اختیار عدالت کو حاصل ہے۔

۴۔ عدلیہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اس وقت کر سکتی ہے جب وہ مکمل طور پر آزاد ہو، انتظامیہ سے علیحدہ ہو، اس میں تقرری، تنزلی اور تبدیلی کا نظام ایسے شفاف اصولوں پر قائم ہو جن کے تحت انصاف کا حصول ممکن ہو سکے، میرٹ کا اہتمام ہو سکے اور سیاسی عناصر اور مفاد پرستوں کی در اندازیوں کی گنجایش نہ ہو۔

۵۔ ہر اس شخص کو جس کے حقوق پامال ہوئے ہوں یا جو ملک کے اہم معاملات سے متاثر ہو رہا ہو، اسے عدالت تک رسائی کا حق حاصل ہے اور عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ اگر انصاف نہیں ہو رہا ہے، تو وہ خود یا کسی بھی شخص کی درخواست پر موثر کارروائی کرے۔ واضح رہے کہ اس فیصلے کے ذریعے ضمنی طور پر ہی سہی، ایک عام شہری کے دو بڑے بنیادی حق تسلیم کیے گئے ہیں یعنی:

(i) خواہ ایک شخص بلاواسطہ متاثرہ پارٹی (aggrieved party) نہ ہو لیکن اگر بنیادی حقوق کا مسئلہ ہے تو ہر فرد ذاتی شکایت (grievance) کے بغیر بھی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔

(ii) اگر زیریں عدالت (خواہ وہ ہائی کورٹ ہی کیوں نہ ہو) میں بلاوجہ مقدمہ تعویق کا شکار ہو رہا ہو (جیسا کہ جہاد ٹرسٹ کا یہ مقدمہ تھا جسے تین سال سے بلاوجہ لٹکایا ہوا تھا اور سماعت ہی نہیں ہو پا رہی تھی) تو براہ راست سپریم کورٹ سے رجوع کیا جا سکتا ہے بشرطے کہ معاملہ بنیادی حقوق کا ہو۔

۶۔ دستور اور قانون کی تعبیر عدلیہ اور صرف عدلیہ کا حق ہے۔ پاکستان کے دستور کی رو سے عدلیہ دستور کی محافظ ہے اور کوئی ایسی قانون سازی جو دستور کے خلاف ہو--- جس کی بنیاد اسلام اور قرارداد مقاصد ہے--- اسے کالعدم کرنے کا دستوری اختیار اعلیٰ عدالتوں کو حاصل ہے۔ گویا عدالتی نظرثانی judicial review پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کا دستوری حق اور ذمہ داری ہے اور بعد کے فیصلوں کی روشنی میں ہر ایسی دستوری ترمیم بھی خلاف قانون و دستور ہو گی جو دستور کی بنیادوں سے متصادم ہو۔

۷۔ دستور ایک وحدت (organic whole) ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے کی تعبیر کرتا ہے۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر اس کے مختلف حصوں کے درمیان بظاہر تنازع اور تناقض ہو تو اس کی ایسی تعبیر کی جائے گی جو باقی حصوں سے ہم آہنگ اور دستور کی بنیادوں کے مطابق یا ان سے قریب تر ہو۔

ان سات بنیادی اصولوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس فیصلے میں ججوں کے تقرر اور عدلیہ کی آزادی کے بارے میں بھی چند بنیادی اصول اور ضابطے طے کر دیے گئے ہیں تاکہ تمام ابہام دور ہو جائیں اور عدلیہ اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دے سکے۔ ان میں اہم ترین یہ چھ اصول اور ضابطے ہیں:

(الف) ججوں کا تقرر میرٹ کی بنیاد پر اور صاف و شفاف طریقے سے ہونا چاہیے۔ یہ عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کا ایک لازمی حصہ ہے۔

(ب) دستور ججوں کے تقرر کے لیے مشورہ (consultation) اور اس کا ایک واضح نظام تجویز کرتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض حکومت کا اختیار نہیں اور اس میں کسی کو بالادستی حاصل نہیں۔

(i) یہ مشورہ محض رسمی نہیں بلکہ لازمی (mandatory) ہے۔

(ii) مشورے میں صدر' چیف جسٹس اور متعلقہ صوبے کا گورنر اور ہائی کورٹس کے لیے متعلقہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس شریک ہوں گے۔

(iii) مشورہ بامعنی' بامقصد' فیصلہ کن اور اتفاق رائے پیدا کرنے والا ہونا چاہیے تاکہ اس امر کی کوئی گنجایش نہ رہے کہ تقرر میں کسی قسم کی بے قاعدگی' سیاسی مصلحت' اثر و رسوخ اور من مانی کارروائی کا دخل ہو۔

(iv) ماضی کی محض سیاسی وابستگی کوئی لازمی نااہلیت (disqualification) نہیں لیکن سیاسی مقاصد کے لیے یا سیاسی رشوت کے طور پر تقرری کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

(v) انتظامی سربراہ (گورنر) ایک فرد کے عام کردار اور پس منظر کے بارے میں صحیح مشورہ دے سکتا ہے مگر اس کی قانونی قابلیت اور صلاحیت کا تعین صرف قانونی مہارت اور تجربہ رکھنے والے افراد ہی کر سکتے ہیں' اس لیے ان معاملات میں چیف جسٹس ہائی کورٹ اور چیف جسٹس آف پاکستان کی رائے حتمی حیثیت رکھتی ہے۔

(vi) تقرر کا آخری اختیار صدر کو حاصل ہے لیکن صدر نہ چیف جسٹس کے مشورے کے خلاف کوئی نام تجویز کر سکتا ہے اور نہ مشورے کے بغیر۔ اگر چیف جسٹس کے مشورے سے اسے اختلاف ہو تو تحریری طور پر وجوہ کا اظہار ضروری ہے اور قانونی قابلیت اور اہلیت کی حد تک چیف جسٹس ان وجوہ / وجوہ انکار پر بات کرنے کا حق رکھتا ہے۔

(vii) تقرری کے لیے چیف جسٹس اور صدر دونوں کا اتفاق ضروری ہے۔ چیف جسٹس کے انکار پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی شخص کو عدالت پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

(viii) تقرر کے بعد ترقی سینیارٹی کی بنیاد پر ہو گی اور یہی صورت ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے لیے بھی ہونی چاہیے تاکہ سب سے سینیر جج اس مقام پر آ سکے۔

(ix) جو جج بطور ایڈیشنل جج کام کر رہے ہوں ان کا مستقل تقرری کے وقت پہلا حق بنتا ہے الا یہ کہ ان کے خلاف کوئی بات ہو۔

(x) جج بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دس سال سے عملاً پریکٹس کر رہا ہو۔ محض رجسٹریشن کافی نہیں ہے۔

(ج) چیف جسٹس کے عہدے پر قائم مقام تقرری صرف عارضی ہو سکتی ہے۔ عام حالات میں ۳۰ دن اور غیر معمولی حالات (مثلاً موت) میں زیادہ سے زیادہ ۹۰ دن۔ قائم مقام چیف جسٹس روز مرہ کے امور کو چلانے کی ذمہ داری ادا کرے گا مگر ججوں کے تقرر میں اس کا مشورہ موثر نہیں ہو گا۔ یہ مشورہ مستقل چیف جسٹس ہی کا ہونا چاہیے۔

(د) ججوں کی خالی آسامیوں کو بھی ایک مہینے کے اندر پر کر دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح خالی ہونے والی آسامیوں کے معاملات کو پہلے سے زیر غور لانا چاہیے تاکہ جگہ خالی ہونے کے ۳۰ دن کے اندر اندر نئی تقرری ہو جائے۔

ضمنی طور پر اس فیصلے نے یہ اصول بھی طے کر دیا ہے کہ دستور میں ۳۰ دن اور زیادہ سے زیادہ ۹۰ دن سے زیادہ کسی بھی عہدے کے خالی رہنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس طرح دستور پر عمل کے لیے ایک میزان وقت طے کر دی گئی ہے جس کا اطلاق تمام تقرریوں اور متعلقہ امور پر ہو گا۔

(ہ) سپریم کورٹ کے ججوں کو ہائی کورٹ میں قائم مقام چیف جسٹس کے طور پر لگانا یا سپریم کورٹ کے ججوں یا ہائی کورٹس کے چیف جسٹس صاحبان کو ان کی مرضی کے بغیر شریعت کورٹ میں بھیجنا دستور کے خلاف اور عدالت کی آزادی کے منافی ہے۔ اس طرح بطور سزا کسی جج کو اس کی مرضی کے خلاف منتقل کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ دستور کے آرٹیکل ۲۰۹، اور اس سلسلے کی دوسری شقوں پر اس کے غلبے کی بڑی واضح تعبیر اس فیصلے میں کر دی گئی ہے۔

(و) مستقل ججوں کی نشستوں کے خالی ہونے کی صورت میں ایڈہاک ججوں کا تقرر درست نہیں۔

سات بنیادی اصولوں کے علاوہ ججوں کے تقرر اور منتقلی کے بارے میں یہ چھ اصول اور ضابطے ہیں جو اس فیصلے میں طے کیے گئے ہیں۔ اس طرح پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عدلیہ نے دستور کے مطابق اپنی حصار بندی اس طرح کی کہ وہ ایک آزاد اور بااختیار ادارے کے طور پر کام کر سکے۔ اور یہ حصار بندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(fortification)' بنیادی حقوق کے تحفظ' قانون کی بالادستی اور انصاف کے حصول کے لیے شرط لازم ہے۔ البتہ ہماری نگاہ میں یہ تمام چیزیں اس مقصد کے لیے ضروری (necessary) تو ہیں لیکن کافی (sufficient) نہیں۔ بدقسمتی سے ان کے ضروری ہونے کو بھی سیاسی قیادتیں قبول کرنے کو تیار نہیں جو جمہوریت اور قانون کی بالادستی کے لیے کوئی نیک فال نہیں۔

عدلیہ نے قانون کی بالادستی اور انصاف کے قیام کے لیے جو حصار بندی کی ہے اسے بڑے غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور اسے پارلیمنٹ کی بالادستی پر ضرب قرار دیا جا رہا ہے جو محض ایک خلط مبحث ہے۔ ہم اس پر آیندہ گفتگو کریں گے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بڑی پارٹیوں اور ان کے وزراے اعظم کے رویے کو بھی پوری دیانت اور معروضی انداز میں سامنے رکھا جائے تاکہ مرض کی صحیح تشخیص ہو سکے۔

محترمہ بے نظیر صاحبہ نے ۲۰ مارچ کے فیصلے کو اپنے اور پارلیمنٹ کے خلاف عدلیہ کی طرف سے اعلان جنگ سمجھا اور آخری وقت تک اس فیصلے پر عمل درآمد کو روکنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ صدر نے جو چارج شیٹ ان کی حکومت کو برطرف کرنے کے جواز میں مرتب کی اس میں ان کے اس رویے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور اسے سپریم کورٹ کی اکثریت نے اس حکومت کا ایک ایسا جرم تسلیم کیا ہے جس پر حکومت کو بجا طور پر برطرف کیا گیا۔

موجودہ وزیراعظم صاحب اور ان کے حواریوں نے بھی عملاً جو رویہ اختیار کیا وہ محض پانچ ججوں کے تقرر میں تاخیر نہیں بلکہ دراصل ۲۰ مارچ کے فیصلے کے مطابق چیف جسٹس کی سفارش نہ مان کر دراصل اس فیصلے اور عملاً اس میں طے شدہ تمام ہی بنیادی اصولوں سے اپنے اختلاف اور ان پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ چیف جسٹس اور عدلت نے جس استقامت کا ثبوت دیا ہے وہ محض رائے پر اصرار نہیں بلکہ ان اصولوں کو منوانے کی جدوجہد ہے--- اور یہ جدوجہد جاری ہے کہ ابھی تک اقتدار وقت نے انھیں کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا۔

آیئے' پہلے دیکھ لیں کہ ان دونوں پارٹیوں کا موقف کیا رہا ہے؟

بے نظیر حکومت کا رویہ' صدر کی چارج شیٹ اور خود عدالت کے فیصلے کا حصہ ہے۔ ان کے موقف کو ذہنوں میں تازہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ کے فیصلے سے حوالہ دیا جا رہا ہے۔

قومی اسمبلی میں وزیراعظم صاحبہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۶ کو بیان دیا جس میں فیصلے پر تنقید کی' اس میں عدالت کو سیاسی دراندازی کا مرتکب قرار دیا گیا اور یہاں تک کہا گیا کہ عدالت میری حکومت کا حصہ ہے۔ ۲۹ مارچ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمایا کہ "سپریم کورٹ ایک منی آئین (mini constitution) کا اضافہ کرنے کا کام نہیں کر سکتی" یہاں تک فرما گئیں کہ "فیصلہ مانا تو چیف جسٹس کو جانا پڑے گا"۔ جرمن ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "حکومت سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہے اور وہ ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں"۔

موجودہ وزیراعظم صاحب نے جو اس وقت قائد حزب اختلاف تھے، بے نظیر صاحبہ اور ان کی حکومت کے اس موقف کو اس وقت دستور سے غداری قرار دیا تھا اور عدالت کو خراج تحسین پیش کیا تھا لیکن اب ان کا کیا موقف ہے؟ وہ اور ان کے تمام ساتھی عدالت کے تعبیر دستور کے حق کو چیلنج کر رہے ہیں اور اسے قانون سازی اور پارلیمنٹ کی بالادستی پر حملہ قرار دے رہے ہیں اور ججوں کی تقرری کو انتظامیہ کا اختیار قرار دے رہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کو تک کم کرنے کا آرڈیننس لے آئے اور پھر اسے واپس لینا پڑا۔ ججوں کی تقرری کو آخری وقت تک التوا میں ڈالا اور جب چیف جسٹس نے دستور کے آرٹیکل ۱۹۰ کے تحت صدر کو اقدام کا مشورہ دیا اور صدر اور چیف آف اسٹاف نے حکومت کے غیر آئینی رویے کی تائید و توثیق سے انکار کر دیا تو "قومی مفاد" میں چیف جسٹس کے مشورے کے مطابق تقرریاں کر دیں۔ لیکن کس ذہنی تحفظ کے ساتھ؟ وزیراعظم صاحب کی تقریر کا یہ حصہ قابل غور ہے:

"پارلیمنٹ پارلیمانی نظام جمہوریت کا سب سے بنیادی اور بالادست ادارہ ہے، قوم کے وقار کی علامت ہے، پارلیمنٹ دستور کی خالق بھی ہے اور اس کی محافظ بھی، دوسرے تمام ادارے موجود ہوں، لیکن پارلیمنٹ نہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا، آمریت نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ پارلیمنٹ ہمارے جسد جمہوریت میں دل کا مقام رکھتی ہے، باقی ادارے اس کے معاون کا کردار ادا کرتے اور دستور کی حاکمیت کی ضمانت دیتے ہیں۔ جمہوریت کے استحکام اور بقا کے لیے لازم ہے کہ ہر ادارہ اپنے دائرے میں کام کرے، کسی دوسرے ادارے کے فرائض خود نہ سنبھال لے"۔

وزیراعظم صاحب یہ دعویٰ کرتے وقت بھول گئے کہ جرمنی اور اٹلی میں فسطائی نظام کے تحت اور ساری اشتراکی دنیا میں اشتراکی آمریت کے دور میں پارلیمنٹ موجود تھی مگر کسی نے اس نظام کو جمہوری تسلیم نہیں کیا!

دونوں پارٹیوں اور ان کے سربراہوں کے خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو بنیادی بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ:

(۱) عدلیہ کو حکومت کا حصہ اور اس کے ماتحت سمجھتے ہیں۔

(۲) عدلیہ کے دستور اور قانون کی آخری تعبیر کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس اختیار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تحت عدلیہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو کالعدم (void) قرار دے سکتی ہے۔ وہ اس اختیار کو پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیار پر حملہ تصور کرتے ہیں۔

یہ دونوں مفروضے غلط اور اسلام اور جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں اور جب تک سیاسی قیادت ان غلط مفروضوں سے برات کا اعلان نہیں کرتی، نہ یہ کش مکش ختم ہوگی اور نہ جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہو سکیں گی۔

عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری اور حکومت وقت سے اس کا جداگانہ وجود اسلام اور جمہوریت کا ایک بنیادی اصول ہے۔ یہ عدلیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ دستور اور قانون کا مکمل احترام ہو رہا ہو اور جہاں بھی اس سے انحراف ہو اور لوگوں کو اصحاب اقتدار یا دوسرے لوگ ان کے حقوق سے محروم کر رہے ہوں وہ ان پر گرفت کرے اور حق دار کو حق دلوائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب حکومت بھی اسی طرح عدالت کے سامنے جواب دہ ہو جس طرح باقی تمام افراد۔ عدالت ہی تو وہ جگہ ہے جہاں خود حکومت کے خلاف دادرسی کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور جس کے سامنے حاکم اور محکوم برابر ہیں۔ یہ صرف آمرانہ اور فسطائی نظام ہی میں ہو سکتا ہے کہ عدلیہ حکومت کا حصہ اور اس کے ماتحت ہو۔ اسلام اور جمہوریت دونوں میں اس کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسلام کے موقف کو سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ سے صرف دو واقعات پیش ہیں۔

خلافت راشدہ میں حضرت علیؓ کا دور خلافت ہے۔ دارالخلافہ کوفہ منتقل ہو گیا ہے اور قاضی شریح چیف جسٹس ہیں۔ امیرالمومنین حضرت علیؓ اور ایک یہودی کا تنازعہ ان کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ امیرالمومنین کی زرہ کہیں گر پڑی تھی جو اس یہودی کے ہاتھ لگ گئی۔ حضرت علیؓ کو پتا چلا تو اس سے زرہ کا مطالبہ کیا مگر یہودی نے زرہ دینے سے انکار کر دیا۔ امیرالمومنین نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چیف جسٹس نے فریقین کے بیان لیے۔ یہودی نے کہا کہ زرہ میری ہے اور ثبوت یہ ہے کہ میرے قبضے میں ہے۔ یہ مدعی کی ذمہ داری ہے کہ ثبوت لائے اور شہادت پیش کرے۔ قاضی شریح نے امیرالمومنین سے اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کرنے کو کہا۔ دو گواہ پیش ہوئے: حضرت حسنؓ اور حضرت قنبرؒ۔ قاضی شریح نے حضرت قنبرؒ کی شہادت قبول کر لی لیکن کہا کہ حسنؓ کی شہادت قابل قبول نہیں۔ حضرت علیؓ نے متعجب ہو کر کہا: آپ حسنؓ کی شہادت مسترد کرتے ہیں جب کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔ قاضی شریح نے کہا: ہاں آپؓ سچ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہی فرمایا لیکن یہ بھی اسلام کا اصول ہے کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر نہیں۔ دوسرا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے امیرالمومنینؓ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس واقعے پر غور کرنے سے تین بڑی بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) عدالت اور حکومت کا ایک دوسرے سے آزاد اور خود مختار وجود۔

(۲) قانون کی حکمرانی۔ حضرت علیؓ امیرالمومنین ہوتے ہوئے بھی اپنی زرہ واپس نہیں لے لیتے اور نہ انتظامیہ کے کسی کارپرداز کو اسے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اقتدار کی قوت کے مقابلے میں عدالت کی قوت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح عدالت کی آزادی اور قیام انصاف اور نفاذ قانون کے باب میں اس کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں۔

(۳) عدالت بے لاگ انصاف کرتی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کو برابر سمجھتی ہے۔ قانون کے مطابق شہادت طلب کرتی ہے اور ناکافی شہادت ہونے پر حکومت وقت کے دعوے کو خارج کر دیتی ہے۔ وہ حضرت حسنؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی گواہی قبول نہیں کرتی کہ یہ اس معاملے میں انصاف کے اصول کے خلاف ہے اور فیصلہ امیرالمومنین کے خلاف جاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا اصول انصاف۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہودی گو مقدمہ جیت گیا لیکن نقد دل ہار گیا۔ بے لاگ انصاف کی اس مثال کو دیکھ کر اعلان کرتا ہے کہ زرہ حضرت علیؓ کی ہے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

دوسرا واقعہ اور بھی آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ یہ خلافت راشدہ کے بعد کا دور ہے، دوسری صدی ہجری کا وسط۔ مسلمانوں کی حکومت تینوں براعظموں تک قائم ہو گئی ہے۔ وسطی ایشیا کا مسلمان فاتح کمانڈر قتیبہ بن مسلم سمرقند میں فاتحانہ داخل ہوتا ہے اور بہترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ البتہ فاتحانہ داخلے کے موقع پر بعض ایسی شرائط کی پاسداری کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے جو محض رسمی نوعیت کی سمجھی گئی تھیں۔ بعض مقامی باشندے قاضی عسکر کے روبرو عرض داشت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ دوران فتح فلاں فلاں شرائط کی پاسداری نہیں کی گئی اس لیے یہ ساری کارروائی کالعدم کی جائے اور فوج کو حکم دیا جائے کہ وہ شہر خالی کر دے۔ چنانچہ سمرقند شہر کے بدھ باشندوں نے قاضی عسکر کے روبرو فاتح کمانڈر قتیبہ بن مسلم کے خلاف عرض داشت دائر کی، قاضی نے اپنے ہی سپہ سالار کے خلاف غیر مسلموں کی شکایات سنیں، سپہ سالار اسلام کا موقف سنا اور حکم دیا کہ شہر خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ جو شہر قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا تھا، وہ اس نے اپنے ہی قاضی کے حکم پر بلا چون و چرا خالی کر دیا اور اہل شہر میں منادی کرا دی گئی کہ اگر اس پورے عمل کے دوران کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ اسلامی شریعت کے مطابق تاوان طلب کر سکتا ہے (بحوالہ مورخ بلاذری، فتوح البلدان، باب فتح سمرقند--- ملاحظہ ہو خطبات بہاولپور، (۲) اسلام کا قانون بین الممالک۔ محمود احمد غازی، ص ۵۹-۶۰)

رہا جمہوریت کا اصول تو مشہور ماہر قانون پروفیسر البرٹ ڈائی سی (Prof. Albert V. Dicey) سے لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سر آئی ور جیننگ (Sir Ivor Jenning) تک سب اس بات پر متفق ہیں کہ عدلیہ کی آزادی، جمہوری نظام کے لیے ضروری ہے۔ عدلیہ مستقل بالذات اور خود مختار ادارہ ہے جو اپنے دائرے میں بالادست ہے۔ پارلیمنٹ کا کام قانون بنانا اور عدلیہ کا کام قانون نافذ کرنا اور اس کی تعبیر کرنا ہے۔ یہ صورت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی ہے جب کہ امریکہ کے دستور اور اس کی تاریخی تعبیرات کی روشنی میں امریکہ اور ان تمام ممالک میں جہاں تحریری دستور نافذ ہیں، عدلیہ کا کام صرف تنفیذ اور تعبیر قانون ہی نہیں بلکہ جوڈیشل ریویو (Judicial Review) کے اصول کے تحت قانون یا حکومتی حکم کے، دستور کے مطابق یا اس سے متصادم ہونے کا فیصلہ کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل ہے۔ امریکہ میں چیف جسٹس مارشل نے ۱۸۰۳ میں Marbury vs Modison کے مقدمے میں اس اصول کو طے کیا تھا جسے وقت کی منصف حکومتوں کے تحفظات کے باوجود بالآخر دستوری قانون کا ایک مسلمہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جب صدر روز ولٹ نے اپنے مشہور زمانہ نیو ڈیل (new deal) کے چند قوانین کو سپریم کورٹ کی طرف سے خلاف دستور قرار دینے پر انتقامی کارروائی کی کوشش کی اور اس کے لیے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کو بڑھا کر اپنی پسند کے جج لگانے کا منصوبہ بنایا تو کانگریس نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دستور کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی اور اس کے جوڈیشل ریویو کے حق کو اجتماعی تائید حاصل ہوئی۔

برطانیہ کے پارلیمانی نظام کے بارے میں لیونارڈ جے سن لوائیڈ (Leonard Jason Lloyed) اپنی کتاب The Constitution (مطبوعہ لندن، فرینک کاس ۱۹۹۶، ص ۴۲-۴۳) میں لکھتا ہے:

"گو ہمارے دستوری نظام میں پارلیمنٹ سب سے بالاتر قانون ساز ادارہ ہے، یہ اختیار عدالتوں کو حاصل ہیں، جو ججوں پر مشتمل ہوتی ہیں کہ ان قوانین کو نافذ کرائیں اور ان کے جواز کا فیصلہ کریں۔ یہ ممکن نہیں کہ پارلیمنٹ کے قوانین ہر انسانی خطا کے بارے میں مداوا فراہم کریں یا ہر غیر قانونی حرکت کا احاطہ کر لیں، اس لیے یہ وظیفہ عدالتوں کا ہے کہ وہ قانون کی تعبیر کریں اور جہاں کوئی واضح حکم موجود نہیں، یا جہاں مفہوم مبہم اور غیر واضح ہو، وہاں خود قانون کا تعین کریں۔ پس جج حضرات خود بھی قانون سازی کا ایک وظیفہ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کامن لا (common law) وجود میں آیا جو ججوں کے بنائے ہوئے قانون سے عبارت ہے، ان تمام امور کے سلسلے میں جو پارلیمنٹ کے ایکٹ میں موجود نہیں۔ نیز ایک بہت اہم ذریعہ جس سے عدالت حکومت پر (اور ایک حد تک خود قانون سازی پر) اپنی گرفت رکھتی ہے اور اسے حدود کا پابند بناتی ہے وہ عدالتی نظرثانی ہے جو خود اب ہمارے ملک (یعنی انگلستان) میں قانون کا سب سے تیزی سے ترقی کرنے والا میدان ہے"۔

لارڈ ڈپلاک (Lord Diplock) نے عدالتی نظرثانی کی تین بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے یعنی--- کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون کے بارے میں یہ طے کرنا کہ اس میں لاقانونیت (illegality) کا کوئی عنصر ہے، یا وہ غیر عقلی (irrationality) ہے یا صحیح طریقے سے وجود میں نہیں آیا (procedural impropriety)۔

ہم نے برطانیہ کے قانونی نظام سے یہ مثال صرف اس لیے دی ہے کہ ہمارے حکمران بار بار پارلیمانی جمہوریت کی بات کرتے ہیں ورنہ امریکہ اور دوسرے تحریری دستور رکھنے والے ممالک، بشمول بھارت کے بارے میں تو یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کا ادارہ نہ صرف یہ کہ ایک مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ادارہ ہے بلکہ اسے جوڈیشیل ریویو کا اختیار حاصل ہے اور اس جوڈیشیل ریویو کا دائرہ صرف قانون تک محدود نہیں بلکہ مختلف ممالک میں وہ دستوری ترامیم تک جو دستور کے بنیادی ڈھانچے سے ہم آہنگ نہ ہوں اس کی زد میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال خود بھارت کی ہے جہاں سپریم کورٹ نے ۱۹۷۳ء کے مشہور مقدمے (Kesavananda Vs. Kerala) میں جسے عرف عام میں بنیادی حقوق کا مقدمہ کہا جاتا ہے (AIR 1973 SC 1461) یہ اصول طے کیا کہ دستور کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم کوئی دستوری ترمیم بھی کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کو نہیں، اس لیے کہ پارلیمنٹ دستور ساز ادارہ نہیں بلکہ دستور ساز ادارے کے بنائے ہوئے دستور میں صرف ترمیم کا اختیار رکھتی ہے۔ اس لیے کوئی ترمیم جو دستور کا حلیہ بگاڑ دے ترمیم نہیں، نئی دستور سازی ہے جس کا اسے اختیار نہیں (ہمارے وزیراعظم صاحب کی تقریر میں جس طرح پارلیمنٹ کو "دستور کا خالق" قرار دیا گیا ہے وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے)۔ اس کی مزید وضاحت اندرا گاندھی بنام راج نرائن کے مقدمے کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کی (AIR 1973 SC 2294) اور صاف الفاظ میں کہا کہ دستور بنانے والوں کا مقصد یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ دستوری ترمیم کے ذریعے وزیراعظم کو "ایک مشرقی آمر مطلق" (an oriental despot) بنا دیا جائے۔ پارلیمنٹ کا ترمیم دستور کا اختیار (آرٹیکل ۳۶۸) اپنی ظاہری لسانی وسعت کے باوجود صرف محدود اختیار دیتا ہے، مطلق نہیں۔ جب اندرا گاندھی نے اس فیصلے کا توڑ کرنے کے لیے دستور میں ترمیم کے آرٹیکل ۳۶۸ میں دو ترامیم (دفعہ ۴ اور ۵) کا اضافہ کیا اور عدالت کے اس اختیار کو ختم کر دیا کہ وہ کسی دستوری ترمیم کو خلاف دستور قرار دے تو سپریم کورٹ نے ۱۹۸۰ میں مائی نرواں کیس (AIR 1980 SC 1989) میں اس ترمیم (یعنی ۴۲ ویں ترمیم) کو منسوخ کر دیا اور اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ پارلیمنٹ کے اس دعوے کو کالعدم کر دیا کہ اس کو ترمیم دستور کا غیر محدود اختیار ہے بلکہ اس کے اس حق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ دستوری ترمیم کے ذریعے عدالت کے اختیار کو محدود کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے جمہوری پارلیمانی نظام میں عدالت کی حیثیت۔

اسلام اور جمہوریت میں عدالت کے مقام اور اختیار کی اس بحث کی روشنی میں ذرا جناب وزیراعظم صاحب کی تقریر کا تجزیہ کیجیے جس میں ہر پارلیمنٹ کو "دستور ساز" قرار دیا جا رہا ہے، سب پر "بالادست"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا جا رہا ہے، اور باقی تمام اداروں کو "اس کے معاون کا کردار ادا کرنے" کا حکم دیا جا رہا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر ان کے رفیق خاص اور وزیر قانون جناب خالد انور صاحب کے ایک مقالے سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے جو موصوف نے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایک سمینیار میں وزارت سے قبل پیش کیا تھا جو زیر طبع کتاب: Pakistan: Secular or Islamic میں شائع ہو رہا ہے:

"عدالت کا یہ اختیار لادینی اور مذہبی دونوں ہی دستوری نظاموں میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد پارلیمنٹ کو اپنی دستوری حدود سے آگے بڑھنے سے روکنا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی اختیار نہیں ہے (اور مختلف ممالک میں اس پر عمل ہو رہا ہے) اسے پارلیمنٹ کے اختیارات کو غصب کرنا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دراصل اس کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ پارلیمنٹ کو ان اختیارات کو غیر قانونی طور پر اپنے قبضہ قدرت میں لانے سے روکا جائے جو اسے حاصل نہیں"۔ (ترجمہ)

آج وزیر قانون صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اور ان کے اس سابقہ موقف کو دیکھا جائے تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

وہی کارواں، وہی منزلیں، وہی قافلہ، وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر، کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

اس وقت ایک مغالطہ یہ بھی دیا جا رہا ہے کہ گویا حالیہ کش مکش پارلیمنٹ اور عدلیہ کے درمیان ہے اور عدلیہ پارلیمنٹ کے اختیارات پر شب خون مارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم نے اوپر جو مثالیں انگلستان، امریکہ اور بھارت کے آئین اور سیاسی نظاموں سے دی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایک جمہوری نظام میں اصل بالادستی دستور کو حاصل ہے اور پارلیمنٹ، حکومت اور عدلیہ تینوں ہی دستور کی مخلوق (creatures of the constitution) ہیں اور سب ہی مساوی طور پر دستور کے تابع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں بااختیار ہے لیکن کوئی بھی کسی دوسرے پر بالاتر نہیں ہے۔ پارلیمنٹ اور عدلیہ کی کش مکش کی بات محض ایک افسانہ اور خلط مبحث ہے۔ البتہ اصل تنازعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر حکومت دونوں دوسرے اداروں یعنی پارلیمنٹ اور عدلیہ پر اپنی بالادستی قائم کرنا اور ان کو اپنا تابع مہمل بنانا چاہتی ہے اور یہی اصل مسئلہ بھی ہے جو جمہوریت کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی اعتبار سے بھی اگر آپ دیکھیں، تو پائیں گے کہ برطانیہ میں چار سو سال تک پارلیمنٹ کی بالادستی کی جو کش مکش ہوئی ہے اس کا کوئی تعلق عدلیہ سے نہیں تھا بلکہ اصل کش مکش بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان تھی۔ Glorious Revolution میں صرف نظری طور پر پارلیمنٹ کی حکومت پر بالادستی تسلیم کی گئی۔ حکومت یا انتظامیہ نام تھا بادشاہ اور اس کی کیبنٹ کا جو پارلیمنٹ سے برسرجنگ رہے۔ عملاً پارلیمنٹ کی یہ بالادستی ۱۹۱۱ کے قانون کے ذریعے قائم ہوئی لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے بعد سے آہستہ آہستہ صورت یہ بن گئی ہے کہ اب عملاً انگلستان کے پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ وزیراعظم کی مٹھی میں چلی گئی ہے اور پارٹی سسٹم کی وجہ سے جو جواب دہی حکومت کی پارلیمنٹ کے سامنے ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت خود انگلستان میں، جہاں اب بھی حکومت پر گرفت اور اس کے موثر احتساب کے ہزاروں راستے ہیں جن میں آزاد پریس، آزاد عدلیہ، موثر حزب اختلاف، سیاست سے پاک بیوروکریسی اور سیکڑوں دستوری روایات ہیں، اس وقت جو علمی مباحث ہو رہے ہیں، ان کا تعلق ایک بار پھر وزیراعظم اور حکومت کے مقابلے میں پارلیمنٹ کی بالادستی کی بحالی سے ہے۔

ٹی بین (T. Benn) اپنی کتاب Argument for Democracy (مطبوعہ لندن، ۱۹۸۱، ص ۱۸-۱۹) میں "دستوری وزارت عظمیٰ" کا تصور پیش کرتا ہے اور رقم طراز ہے:

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ برطانیہ کا وزیراعظم اس وقت جن اختیارات کا مالک ہے، ان کا دائرہ، وزیراعظم اور پارٹی لیڈر دونوں حیثیتوں سے اتنا بڑھ گیا ہے کہ یہ ووٹروں کے جائز قانونی حقوق پر اثرانداز ہوتا ہے، پارلیمنٹ کے ضروری کردار کو نقصان پہنچاتا ہے اور کابینہ کے اجتماعی فیصلے کرنے کے بعض اختیارات کو سلب کرلیتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک فرد کے ہاتھ میں اختیارات کا موجودہ ارتکاز بہت زیادہ ہو گیا ہے اور عملاً اس نے ہماری پارلیمانی جمہوریت کے قلب میں شخصی حکومت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ وزیراعظم اور پارٹی لیڈر کو ان افراد کے سامنے زیادہ جواب دہ ہونا چاہیے جن پر وہ اپنے اختیارات استعمال کرتا یا کرتی ہے تاکہ ہم برطانیہ میں دستوری وزارت عظمیٰ قائم کرسکیں۔ مطلق وزارت عظمیٰ کو دستوری وزارت عظمیٰ میں تبدیل کرنے کے لیے اس کے وظائف میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کرنا ہوں گی جو اس نوعیت کی ہوں گی جو تاج برطانیہ کو مطلق بادشاہت سے دستوری بادشاہت میں تبدیل کرنے کے لیے کئی برسوں کے دوران کی گئی تھیں۔ تبدیلی کے حق میں دلائل موجودہ نظام کے تجربے سے فراہم ہوتے ہیں جس میں وزیراعظم کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے کی طاقت حاصل ہے"۔

ایک اور حالیہ کتاب، British Politics: Constitutional Changes (مطبوعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، آکسفورڈ، ۱۹۹۰) میں پروفیسر ڈی کیواناج (D. Kavanagh) اسی موضوع سے بحث کرتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خصوصیت سے مارگریٹ تھیچر کی وزارت عظمیٰ کے بارے میں کہتا ہے: اب انگلستان میں جو طرز حکومت رائج ہے اسے .Prime Ministerial Govt کہنا بجا ہو گا (ص ۲۰۸)۔ پارلیمانی جمہوریت کا جب یہ عالم انگلستان میں ہے تو قیاس کیجیے کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، جہاں عملاً پارلیمنٹ ایک عضو معطل ہے، اقتدار کا سارا ارتکاز وزیراعظم کے ہاتھوں میں ہے، کابینہ بھی اس کی مٹھی میں ہے، تمام اہم فیصلے کابینہ اور پارلیمنٹ کے باہر ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے لیے نمایندگی کے لیے ٹکٹوں کی تقسیم سے لے کر ریاستی امور پر فیصلوں تک اہم بین الاقوامی معاہدوں سے لے کر تمام بنیادی تقرریوں تک (جو کبھی تو تھانے دار اور میونسپل کونسلر تک کی سطح کو چھو لیتے ہیں) سب ہی اختیار وزیراعظم کے ہاتھ میں ہے۔ یہ "پارلیمانی جمہوری نظام" نہیں "وزیراعظمی نظام" ہے اور وہائی دی جا رہی ہے پارلیمنٹ کی بالادستی کی!

برعکس نہند نام زنگی کافور!

ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اصل مسئلہ پارلیمنٹ اور عدلیہ کا نہیں، اصل مسئلہ حکومت بلکہ وزیراعظم اور عدلیہ کا اور وزیراعظم اور پارلیمنٹ کا ہے۔ اس پس منظر میں چودھویں دستوری ترمیم بڑی معنی خیز ہے۔ پارلیمنٹ کی بے بسی کا اندازہ تو اس کیفیت سے کیا جا سکتا ہے جس میں تیرھویں اور چودھویں دستوری ترامیم دونوں ایوانوں سے منظور کرائی گئی ہیں تو کوئی مشورہ ہوا، نہ کوئی قومی بحث ہوئی، نہ پارلیمنٹ میں بحث ہوئی بلکہ اس تجربے کی روشنی میں جو راقم کو ۱۲ سال تک سینیٹ میں ہوا، یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ارکان کی اکثریت نے ان ترامیم کے پورے متن کو ایک بار پڑھا بھی نہیں ہو گا۔ بس وزیراعظم کے حکم پر ارکان کو ڈھور ڈنگر کی طرح سارے ملک میں نہیں ساری دنیا میں وہ جہاں بھی تھے، وہاں سے اسلام آباد لے آیا گیا اور چند گھنٹوں میں قومی اسمبلی اور سینیٹ سے اتنی اہم دستوری ترامیم منظور کروا ڈالی گئیں۔ یہ ہے وہ طرز حکومت جو جمہوریت کے لیے اصل خطرہ، اور پارلیمنٹ کے اختیارات غصب کرنے کی بدترین مثال ہے۔

چودھویں ترمیم کے ذریعے وزیراعظم اور پارٹی لیڈر کی گرفت تمام "منتخب نمایندوں" پر اور بھی سخت کر دی گئی ہے۔ مفاد کی خاطر پارٹی بدلنا اور "لوٹا ازم" بلاشبہ اسلام، اخلاق، شرافت، غیرت، جمہوریت ہر ایک کے خلاف ہے اور جو حضرات آج اس کے خلاف گل افشانیاں کر رہے ہیں، وہی ماضی میں اور آج بھی اس مال کے سب سے بڑے تاجر رہے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ایک پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر مفاد کی خاطر پارٹی بدلنا ایک برائی اور جرم ہے اور اس پر پابندی ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن منتخب نمایندوں کی مکمل زبان بندی، پارلیمنٹ میں اظہار رائے کی آزادی سے ان کو محروم کر دینا اور محض پارٹی لیڈر کے پرچے پر ان کی رکنیت ختم کر دینا، اسلام اور جمہوریت دونوں کے اعتبار سے ایک ناروا اختیار ہے اور ضمیر کی آزادی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشرف المخلوقات کے عزت نفس کے خلاف ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو اصل معیار حق قرار دیتا ہے (یَا اَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۴:۵۹)) معروف میں اطاعت امیر کا حکم بلاشبہ اسلام دیتا ہے مگر شوریٰ کے نظام کے ساتھ۔ نیز معصیت میں کسی بڑے سے بڑے کی اطاعت سے بھی منع کرتا ہے (لا طاعۃ المخلوق فی معصیت الخالق)۔ اسلامی نظام میں شورائیت اور جمہوریت ہے۔ نیز ڈسپلن ایک بات ہے اور زباں بندی ایک بالکل دوسری شے ہے' خواہ پارٹی کے اندر ہو یا پارٹی کے باہر۔ چودھویں ترمیم کا مقصد منتخب ارکان پر فرد واحد کے استبداد کو قائم کرنا ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ پارٹی لیڈر ہی آخری اتھارٹی ہے۔ وہ سیدھا الیکشن کمشنر کو فارغ خطی لکھ کر بھیج سکتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے جو طریقہ سیاسی جماعتوں کے قانون میں تھا اس میں شکایت اسپیکر اسمبلی' چیئرمین سینیٹ کو جاتی تھی' جو اسے الیکشن کمشنر کو بھیجتا تھا۔ جو طریقہ چودھویں ترمیم میں اختیار کیا گیا ہے وہ بڑا غلط' آزادی کش اور بھونڈا طریقہ ہے خواہ ترمیم کا اصل مقصد کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ اس پر جو عارضی گرفت سپریم کورٹ نے کی ہے اسے بہانہ بنا کر عدالت کی تحقیر اور تذلیل کی جا رہی ہے اور عدلت کو "لوٹا ازم" کا محافظ قرار دیا جا رہا ہے جو سیاسی غنڈہ گردی کی بدترین مثال ہے۔

جمہوری ممالک میں اس سلسلے میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ ڈسپلن اور آزادی کے درمیان کی چیز ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں صرف فرنٹ بنچ پر جس کی حیثیت کیبنٹ یا سیکنڈ کیبنٹ کی ہوتی ہے' اختلاف رائے کے اظہار پر ایک حد تک پابندی ہوتی ہے گو عملاً وزرا تک کے درمیان اختلاف بھی پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر سامنے آتا رہتا ہے۔ لیکن پارٹی کے باقی تمام ارکان جنھیں بیک بنچرز کہا جاتا ہے ان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی اور وہ خود اپنی حکومت کے احتساب کا فرض انجام دیتے ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ میں خود اپنے بیک بنچرز کے عدم اطمینان کی وجہ سے ۷۴-۱۹۷۰ کے درمیان چار سال میں پانچ بار اور ۱۹۷۴ میں صرف ایک سال میں ۱۴ مرتبہ نیز ۱۹۷۴ سے ۱۹۷۵ تک ۲۹ بار سرکاری قرارداد ناکام (defeat) ہوئی لیکن اسے پارٹی کا بدلنا (defection) نہیں سمجھا گیا۔ اہم مسائل پر پارٹی وہپ (یعنی پارٹی کے حق میں ووٹ کی پابندی) بھی اٹھا لیا جاتا ہے اور ضمیر کے مطابق ووٹ کی آزادی ہوتی ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کی روایت یہ ہے کہ انتخابات کے بعد ایک ممبر پارلیمنٹ کی تین حیثیتیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ ایک اپنے حلقہ انتخاب کا نمائندہ جس میں وہ پوری آبادی کی نمائندگی کرتا ہے محض اپنی پارٹی کی نہیں' دوسرے پورے ملک کی سطح پر ملک کا منتخب نمائندہ اور تیسرے پارٹی کا ایم پی ---- ان تینوں حیثیتوں میں توازن قائم کیا جاتا ہے اور صرف پارٹی بدلنے کو defection سمجھا جاتا ہے' آرا کے اظہار اور پارٹی قیادت سے اختلاف حتیٰ کہ پارٹی وہپ کی خلاف ورزی بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

defection شمار نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ ہو The Changing Constitution ed by, Jowel and Olivu خصوصیت سے باب چہارم جدید برطانوی جمہوریت ---- نظریہ اور عمل از Anthony H. Buch اور باب پنجم ---- ڈان اولیور (Dawn Oliver) پارلیمنٹ اور سیاسی جماعتیں۔

ہم ایک بار پھر اس بات کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور شخصی طرز حکمرانی سے ہے جو پارلیمانی جمہوریت کے نام پر یہاں فروغ دیا جا رہا ہے اور جس کے نتیجے میں کابینہ اور پارلیمنٹ دونوں غیر موثر بن گئے ہیں۔ حکمرانوں کے ان لامحدود اختیارات پر اگر کوئی تھوڑی بہت قدغن ہے تو وہ عدلیہ کی طرف سے آئی ہے' اس لیے عدلیہ کو پابہ زنجیر کرنے اور اپنے زیر اثر رکھنے کی ہر دور میں کوششیں ہوتی رہی ہیں اور اس وقت بھی یہی لڑائی جاری ہے۔

جمہوریت کو اصل خطرہ اسی ذہنیت اور اسے گوارا کرنے والے سیاسی کلچر سے ہے۔ عدالت کی آزادی اور خود مختاری اور پارلیمنٹ کی حکومت پر بالادستی اور گرفت ہی کے ذریعے اس بگاڑ کو درست کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سیاست کے پورے نظام اور انداز کو بدلا جائے' عوام میں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا شعور بیدار کیا جائے' پریس اپنا کردار آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرے' متوسط طبقے اور عوام سے نئی قیادت ابھرے' پارٹیوں کی تنظیم اصول اور پروگرام کی بنیاد پر ہو اور خود ان کے اندر بھی جمہوریت قائم کی جائے' احتساب اور جواب دہی کا نظام رائج ہو اور ملک میں بھی دستور اور قانون کی حکمرانی اور قانون کے سامنے سب کی برابری کا نظام عملاً قائم کیا جائے۔ آزاد صحافت اور عدالت کی آزادی اور خود مختاری اس نظام کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ ملک میں تمام اداروں کی حفاظت اور استحکام کے بغیر جمہوری عمل پروان نہیں چڑھ سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں شخصیت پرستی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ جو اقتدار پر آگیا' اس کے بارے میں کہا جانے لگتا ہے کہ "وہ ناگزیر ہے" حالانکہ قدرت کے اس کارخانے میں کوئی بھی ناگزیر نہیں ---- رہے نام اللہ کا! یادش بخیر' خوشامدیوں نے جب فرانس کے وزیراعظم کلے مین شو (Clemencheau) سے جس نے ملک کو جنگ عظیم میں فتح سے شاد کام کیا تھا کہا کہ آپ فرانس کے لیے ناگزیر (indispensable) ہیں تو اس نے ان کے منہ پر یہ کہہ کر طمانچہ مارا کہ سارے indispensable انسانوں سے قبرستان بھرا پڑا ہے۔

جو حضرات اس وقت عدالت کی آزادی پر تیشہ زنی کر رہے ہیں انھیں سمجھنا چاہیے کہ اداروں کو بنانا اور ان کی حفاظت کرنا بڑا محنت طلب اور صبر آزما کام ہے جب کہ ان کو بگاڑ دینا بڑا آسان ہے۔ جناب خالد انور کے اس مضمون سے ایک اقتباس خود ان کی اور سارے اراکین پارلیمنٹ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ کاش کہ یہ کسی حد تک بھی نظر کشا ثابت ہو!

"اداروں کے بنانے میں کئی نسلیں نہیں تو کئی عشرے ضرور لگتے ہیں لیکن ان کو تباہ کرنے کا کام صرف چند گھنٹوں میں نہایت مستعدی اور سفاکی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ بے حرمتی کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی دنیاوی اقتدار کی کرسیوں پر متمکن نہیں رہیں گے۔ اس ملک کے عوام کے ساتھ یہ بڑا ظالمانہ اور خوفناک فراڈ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیکولر حکمران، دستور کے دیے گئے تحفظات چھین رہے ہیں۔ میعاد (tenure) کے تحفظ کو، جو عدلیہ کی آزادی کی بنیاد ہے، مجروح کر دیا گیا ہے اور "نگہبانوں" (baneful eye) نے چاہا ہے کہ عدالت کے ذریعے اصلاح (judicial rectitude) کی نازک کونپل کو پنپنے سے روک دیا جائے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہی لوگ جو، جب حزب اختلاف میں تھے، آزاد اور خود مختار عدلیہ کے لیے سب سے بڑھ کر بول رہے تھے، آج ملک میں عدل کے قلعے پر سوچا سمجھا حملہ کر رہے ہیں۔ شاید جو سب سے زیادہ چیخ پکار کرتے ہیں، لازماً سب سے زیادہ مخلص نہیں ہوتے۔ انتظامیہ کے آمرانہ احکامات سے عدلیہ کی آزادی پر حملہ، ان افراد کے لیے جو ایک آزاد اور منصفانہ معاشرہ چاہتے ہیں، سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ (ترجمہ)

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

جمہوریت کے مستقبل کا انحصار قوم کے عزم اور قیادت کے انداز حکمرانی کی صحیح رخ پر تبدیلی پر ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور سب سے اہم ہیں:

اول، اسلام کے بارے میں مکمل یکسوئی رکھنا اور ظاہرداری، منافقانہ روش اور تناقض سے اپنے رویے کو پاک کرنا ہے۔ کسی کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند، یہ ایک نظری ہی نہیں تاریخی حقیقت ہے کہ ملک کے عوام اسلام کو چاہتے ہیں اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام یا طریقہ مسلمانوں میں کامیابی سے چلایا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عملی نقطہ نظر سے اسلام اور جمہوریت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر جمہوریت قانون کی حکمرانی اور عوام کی مرضی اور خواہش کے مطابق نظام زندگی کو چلانے کا نام ہے تو صرف اسلام ہی کے ذریعے جمہوریت روبہ عمل آ سکتی ہے اور نفاذ اسلام اور جمہوریت کی ترویج دونوں ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اسلام اور سیکولرازم کی کش مکش، آمریت اور فسطائی نظاموں پر منتج ہوئی ہے اور کسی ملک میں بھی غیر اسلامی اور خالص سیکولر قوانین جمہور کی تائید سے نہیں بلکہ آمریت کی استبدادی قوت کے ذریعے نافذ ہوئے ہیں۔ مغرب کے اہل نظر میں پروفیسر ولفریڈ اسمتھ (Prof. Dr. Wilfred Smith) نے اس حقیقت کا بہت ہی صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اسلامائزیشن ہی دراصل جمہوری عمل کے ذریعے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رونما ہو سکتا ہے اور اسلامی نظام ہی جمہور کی مرضی اور امنگوں کی تکمیل سے ہم آہنگ ہے۔ ملاحظہ ہو Pakistan as an Islamic State- فلسفہ، تاریخ اور سوشیالوجی کے ایک اور استاد پروفیسر ڈاکٹر فلمر نارتھروپ (Dr. Filmer Northrop) اپنے ایک مقالے میں جو ۱۹۵۸ کے اسلامی کلچر پر کلوکیم میں پیش کیا گیا تھا اور اسی سال پرنسٹن یونی ورسٹی سے شائع ہوا، ترکی اور مغربی ممالک کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"مجھے یقین ہے کہ ایسے قوانین (یعنی سیکولر قوانین) کے اول اول کسی نہ کسی آمر کے ذریعے نافذ ہونے کی یہی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس لیے کہ یہ قوانین کسی عوامی تحریک کے ذریعے کتاب قانون کا حصہ نہیں بن سکتے کیونکہ عوام تو پرانی روایت سے وابستہ ہیں"۔ (ترجمہ)

اس لیے ضروری ہے کہ سیکولرازم اور اسلام کی کش مکش کو پوری یکسوئی کے ساتھ دفن کر دیا جائے اور جو بھی جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اور اس نظام کا فروغ چاہتا ہے، خواہ اس کا تعلق ملک کی آبادی سے ہو یا باہر کی قوتوں سے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جمہوریت پرستی ہی کا تقاضا ہے کہ اسلام کو متنازع نہ بنایا جائے اور اس کو قانونی، معاشی، تعلیمی، سماجی و ثقافتی غرض ہر میدان میں نافذ کرنے کی موثر کوشش کی جائے۔ یہی ہمارے دستور کا تقاضا ہے جس کا حلف ہم نے لیا ہے اور یہی ۲۰ مارچ کے عدالتی فیصلے کا منطقی مطالبہ ہے۔ جو افراد اسلام کے نظام کو اپنے ایمان اور اپنے دین کا تقاضا سمجھتے ہیں وہ تو حق بجانب ہیں ہی، لیکن جو کسی بھی وجہ سے اسلام اور اس کے نظام کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں، ان کا بھی فرض ہے کہ اگر وہ جمہوریت کے بارے میں مخلص ہیں اور ملک میں جمہوریت کے مستقبل کو روشن اور تابناک دیکھنا چاہتے ہیں تو جمہور کی رائے کے احترام میں اسلام کی تائید کریں اور اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں--- ورنہ یہ کش مکش جاری رہے گی اور ملک کو جمہوری اور دستوری استحکام حاصل نہیں ہو سکے گا۔

دوم، حکمران اور دوسری موثر سیاسی قوتوں کے رویے کی تبدیلی ہے۔ دستور اور قانون ایک چیز ہے، دونوں بے حد اہم، لیکن دستوریت (constitutionalism) اور احترام دستور و قانون، شے دگر است۔ بلاشبہ ہمارے یہاں دستور و قانون کی اصلاح بھی، جہاں ضروری ہو، مطلوب ہے، لیکن اس سے زیادہ ضروری، دستور اور قانون پر عمل کرنے، دستور کے مطابق معاملات کو طے کرنے اور اس کے مطابق عملی رویے کو ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ آمریت، فسطائیت اور ظلم کا آغاز بھی اسی مقام سے ہوتا ہے کہ اپنے کو دستور اور قانون سے بالا سمجھا جائے یا دستور اور قانون کو اپنی مرضی یا مفاد کے تابع کرنے اور اسے ان کا موید بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے جب تک رویے نہیں بدلتے اور طرز حکمرانی اور فیصلے کرنے کا انداز تبدیل نہیں ہوتا، دستور اور قانون کی حکمرانی ایک خواب ہی رہے گا۔ اس تبدیلی کو لانے کے لیے تعلیم، رائے عامہ اور سماجی دباؤ (pressure) کے ساتھ ساتھ صحافت، سیاسی جماعتیں، کارکن اور عدلیہ بڑا موثر اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں اور اسی کی ضرورت ہے۔

سوم، عوامی طاقت سب سے موثر عنصر ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر عوامی رابطہ، ان میں اپنے حقوق اور فرائض کا احساس بیدار کرنا اور بالآخر ان کا ایسا mobilisation کہ ان کے عزائم، امنگوں، خواہشات اور ضروریات کو نظرانداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہ رہے۔

اس پس منظر میں ہم عدلیہ کی حالیہ کوششوں کو بڑی تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جمہوریت کے مستقبل کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں۔ عدالتی فعالیت دراصل وقت کا تقاضا اور قیادتوں کے دستور اور قانون سے بے نیاز ہو جانے کا لازمی ردعمل ہے۔ جس طرح ایوب خان کے مارشل لا کے دور میں جسٹس کیانی مرحوم نے جمہوری احیا کی لہر کو پروان چڑھانے میں مثبت کردار ادا کیا، اسی طرح ۲۰ مارچ ۹۶ اور اس کے بعد عدالت عالیہ اور اس کے سربراہ کی خدمات ملک کو دستوریت اور احترام قانون کی طرف لانے کا ذریعہ بنے گی۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا تجربہ منفرد نہیں ہے۔

ہم اس تجزیے کو ختم کرنے سے پہلے چند گزارشات عدلیہ کے ذمہ دار حضرات سے بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنا کردار اور بھی زیادہ موثر انداز میں ادا کر سکیں۔

۱- جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں شوریٰ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح خود عدلیہ کے اندر بھی شوریٰ کی موثر روایت قائم ہونی چاہیے۔ اگر عدالت کی حصار بندی اسے سیاسی عناصر کی دخل اندازی سے بچانے کے لیے ضروری ہے تو اس حصار کے اندر بھی ان اصولوں کا احترام اور ان کی ترویج ضروری ہے جو اسلام نے عدل و انصاف اور خیر و فلاح کے حصول کے لیے ضروری قرار دیے ہیں اور یہ مقصد صحت مند دستوری روایات (conventions) کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۲- عدلیہ کی عزت اور وقار کا اصل انحصار تو اس کے منصفانہ فیصلوں اور حق کے اظہار کے باب میں استقامت پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے درمیان باہمی اعتماد، تعاون اور ایک دوسرے کے احترام کی جو اعلیٰ روایت ہماری پوری تاریخ میں بشمول حالیہ تاریخ رہی ہے، ان کو قائم رکھا جائے اور مزید مستحکم کیا جائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ باہمی اختلاف کے باوجود عدالت کی وحدت، یک رنگی اور اعتماد باہمی پر کبھی حرف نہیں آیا۔ ججوں کا ایک دوسرے کو "برادر جج" کہنا محض ایک طرز بیان نہیں بلکہ ایک گہرے تعلق اور ادارے کے کلچر کی علامت ہے۔ پچھلے دنوں اعلیٰ عدالت میں اختلاف رائے پیدا کرنے یا موجود ہونے کا جو تاثر سامنے آیا ہے، اسے صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اختلاف رائے اور ضمیر اور ضابطے کا احترام سب کے لیے ضروری ہے، لیکن معاملات کی صورت گری اور اظہار، دونوں کے آداب ہیں اور یہ آداب کا احترام ہی ہے جو معاملات میں حسن اور توازن پیدا کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ عدلیہ میں احتساب بھی ضروری ہے تاکہ وہ قوم کا بے لاگ احتساب کر سکے اور زیادہ سے زیادہ شفاف انداز میں کر سکے۔ عدلیہ ہی وہ ادارہ ہے جسے آج بھی سارے بگاڑ کے باوجود ہر شک و شبہ سے بالا سمجھنے کے لیے قوم تیار بھی ہے اور اس کی خواہش مند اور متمنی بھی۔ نیز جمہوریت کی بقا کے لیے بھی یہ بے حد ضروری ہے۔ اس لیے عدلیہ کو خود اپنے نظام کے تحت اس کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

۴۔ عدلیہ کی اصل کامیابی کا انحصار جہاں دستور اور قانون کے تحفظ پر ہے، وہیں عام انسانوں کو ان کی روز مرہ زندگی میں ظلم سے بچانے اور انصاف مہیا کرنے پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ہزاروں مقدمات طویل طویل مدتوں سے مختلف سطح کی عدالتوں میں معلق ہیں۔ ہزاروں افراد جیلوں میں اس لیے پڑے ہیں کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ایسے حالات بھی سامنے آئے ہیں کہ جس جرم میں زیادہ سے زیادہ سزا چند متعین سال تھی، ان کے ملزم مقدمے کے فیصلے سے قبل اس سے کہیں زیادہ مدت جیلوں میں سڑتے رہے ہیں۔ انصاف میں تاخیر بھی اتنی بڑی بے انصافی ہے جتنی انصاف کی خلاف ورزی۔ ہر سطح پر ہماری عدلیہ کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے اور ہمارے وکلا کو محض دولت کمانے کو زندگی کا مشغلہ نہیں بنا لینا چاہیے بلکہ جلد، سستے اور مکمل انصاف کی فراہمی میں معاون اور مددگار ہونا چاہیے۔ اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ہمارے تمام دستوری اداروں کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے پھل سے کس حد تک اس ملک کے عوام کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن محض ایک رسالہ نہیں، فی الحقیقت ایک پیغام، ایک دعوت اور ایک تحریک ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس پرچے کو کسی ذاتی یا مالی فائدے کے لیے جاری نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اس کی آبیاری اپنے خون جگر سے صرف اس لیے کی تھی کہ اس کے ذریعے اللہ کے بندوں تک اللہ کے دین کا پیغام پہنچے اور وہ سب سے سچے انسان صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے رب کی بندگی کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے اپنی علمی اور عملی سرگرمیاں وقف کر دیں۔ بس یہی وہ لگن تھی جس نے میرے ساتھی اور رفیق اور ہم آپ سب کے محبوب و محترم بھائی خرم مرادؒ کو بے چین کر دیا اور جب ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری ان پر پڑی تو انھوں نے اپنی ساری توانائی اسے ظاہری اور باطنی لحاظ سے نئی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے وقف کر دی حتیٰ کہ گذشتہ سال دسمبر میں وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ جس کے بعد یہ ذمہ داری میرے اور میرے رفقا کے کمزور کاندھوں پر آ گئی۔

لیکن الحمدللہ ہم بھی اسی جذبے سے سرشار اپنی زندگیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنے کو اپنی دنیوی اور اخروی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ خرم بھائی کی دلی خواہش تھی کہ ترجمان القرآن ہر پڑھے لکھے گھر

© rasailojaraid.com